ڈاکٹر عبادت بریلوی کی خودنوشت ''یادِ عہدِ رفتہ'' کا تہذیبی وسماجی مطالعہ

ڈاکٹر مسرت بانو
Dr. Musarrat Bano

Abstract:

Dr. Ibadat Breilvi was a well known critic, an accomplished researcher and a well reputed Scholar. His autobiography'' Yad-E- Eihd-E Rafta'' describes not only the biographical details of the author but also portrays the entire historical and socio cultural situation of the society in a specific era. As the Civilization consists on a complete code of life, acquaintance and fine arts ,etiquette, attitude, and mode of life of a nation, this autobiography replicates the all activities of Indian Society, either are intellectual, materialistic, and exterior or interior and revealed or concealed. This article presents detailed study of this autobiography in historical ,religious,and socio cultural prospectives of Society.

انگریزی زبان میں تہذیب کے لیے 'کلچر' کی اصلاح استعمال کی جاتی ہے جو کہ لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی کھیتی باڑی کرنا، ریشم کے کیڑوں کی افزائش، زراعت اور جسمانی یا ذہنی اصلاح اور ترقی کے ہیں۔ 'کلچر' کا اردو میں ترجمہ 'ثقافت' کے نام سے کیا گیا ہے اور عام طور پر تہذیب وثقافت کو ایک ہی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ثقافت عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی کسی چیز کو سمجھ لینا، مہارت حاصل کرنا اور علوم پر قدرت ہے۔ یوں انگریزی لفظ 'کلچر' اردو، عربی اور فارسی کے الفاظ ''تہذیب وثقافت'' دونوں کے مفہوم پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی 'ثقافت' اور 'تہذیب' کے معنی کو یکجا کر کے ان کے لیے لفظ 'کلچر' کا استعمال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''لغات میں جن معنی میں یہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں ان سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ لفظ ''تہذیب'' کا زور خارجی چیزوں اور طرزِ عمل کے اس اظہار پر ہے جس میں خوش اخلاقی،

اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ کالج برائے خواتین، شاہ پور (سرگودھا)

اطوار، گفتار اور کردار شامل ہیں۔ اور لفظ ''ثقافت'' کا زور ذہنی صفات پر ہے جن میں علوم وفنون میں مہارت حاصل کرنا اور ترقی دینے کی صفات شامل ہیں۔ میں نے لفظ تہذیب اور ثقافت دونوں کے معنی کو یکجا کر کے ان کے لیے ایک لفظ ''کلچر'' استعمال کیا ہے جس میں تہذیب اور ثقافت دونوں کے مفہوم شامل ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ کلچر ایک ایسا لفظ ہے جو زندگی کی ساری سرگرمیوں کا، خواہ وہ ذہنی ہوں یا مادی، خارجی ہوں یا داخلی، احاطہ کر لیتا ہے۔''(۱)

ڈاکٹر جمیل جالبی کی رائے کے مطابق تہذیب وثقافت کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور ان دونوں الفاظ کا مفہوم باہم اس طرح گتھا ہوا ہے جیسے جسم میں خون اور گودا۔ ثقافت اگر خیال ہے تو تہذیب پیکر، ثقافت سوچ ہے تو تہذیبِ عمل اور جس طرح عمل کے بغیر سوچ اور پیکر کے بنا خیال بے معنی ہے، اسی طرح تہذیب کے بغیر ثقافت وجود میں نہیں آ سکتی۔ سبطِ حسن تہذیب کو کسی معاشرے کی بامقصد تخلیقات اور سماجی اقدار پر محیط قرار دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''کسی معاشرے کی بامقصد تخلیقات اور سماجی اقدار کے نظام کو تہذیب کہتے ہیں۔ تہذیب معاشرے کی طرزِ زندگی اور طرزِ فکر و احساس کا جوہر ہوتی ہے۔ چنانچہ زبان، آلات و اوزارِ پیداوار کے طریقے اور سماجی رشتے، رہن سہن، فنونِ لطیفہ، علم و ادب، فلسفہ وحکمت، عقائد وافسوں، اخلاق وعادات، رسوم وروایات، عشق ومحبت کے سلوک اور خاندانی تعلقات وغیرہ تہذیب کے مختلف مظاہر ہیں۔''(۲)

کلچر کے اجزائے ترکیبی اور عناصر میں زندگی کے جملہ مظاہر اور تمدن کے تمام پہلو شامل ہیں جن سے قومیں اور تہذیبیں ایک دوسرے سے ممتاز ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کلچر کو کسی سماج کی تنظیم اور اس کے ذوق لطیف پر محیط قرار دیتے ہیں جس سے یہ زندگی کے تمام لوازمات یعنی رہنے سہنے کے طریقوں، کھانے پینے کے آداب، میل جول کے طور اطوار، رسوم ورواج، مشاغل اور فنونِ لطیفہ کے جملہ پہلوؤں پر حاوی ہو جاتا ہے۔[۳] کلچر دراصل تمام معاشرے اور اس کی ساری خصوصیات پر حاوی ہے لہٰذا اس کی حدوں کو مقرر کرنا ممکن نہیں، کیونکہ جس طرح معاشرہ اور افراد معاشرہ ہر آن تغیر اور ارتقا سے دوچار رہتے ہیں اسی طرح کلچر کی حدود میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ افراد معاشرہ کے افکار و نظریات، عقائد وعبادات، رسوم ورواج، طرز بود وباش اور علوم وفنون، غرض زندگی کی تمام تر صورت حال پر مشتمل ہے۔(۴) کلچر چونکہ زندگی کے تمام فکری وعملی پہلوؤں پر محیط ہے، اس لیے تہذیب کے جملہ فکری و عملی پہلو بھی کلچر کا حصہ ہوتے ہیں۔

فیض احمد فیضؔ عقاید و ایمانیات، آداب واطوار اور فنون لطیفہ کو کلچر کے تین اہم اور بنیادی عناصر قرار دیتے ہیں جو باہم مربوط ہوتے ہیں:

''ہر قوم کی تہذیب یا کلچر کے تین پہلو ہوتے ہیں۔ ایک اس قوم کے اقدار اور احساسات اور عقائد جن پر وہ یقین رکھتی ہے۔ دوسرے اس کے طریقے، اس کے آداب اور اس کے اخلاق ظاہری اور تیسرے اس کے فنون۔ یہ تینوں ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں جنہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔'' (۵)

ماضی کے آثار، کتابیں، شہادتیں، سکّے اور عمارتیں ہی تہذیب کے ماخذات نہیں ہیں بلکہ تہذیب و تاریخ کے ماخذ وہ لوگ بھی ہیں جو خود اس تاریخی اور سماجی عمل کا حصّہ رہے ہیں۔ لہٰذا ادبا کی تصنیفات، عوام میں مقبول لوک گیتوں، کسی عہد میں نبھائے جانے والی رسوم و رواج اور ایک خطہ ارض کے عوام کی عادات و اطوار میں تہذیب کے نمونے چھپے ہوئے ہیں جن کا جائزہ لینے کے لیے تاریخ کے روایتی بیانیے سے ہٹ کر دیگر ثقافتی اور سماجی بیانیوں کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ مقتدر اور مشہور زمانہ شخصیات کی خودنوشتیں بھی ایسے ہی سماجی اور ثقافتی بیانیے کی حیثیت رکھتی ہیں جو نہ صرف اپنے لکھنے والوں کے حالات زندگی پر مبنی ہوتی ہیں بلکہ ایک خاص عہد کی سیاسی، مذہبی، سماجی، تہذیبی اور معاشی صورت حال کی عکاسی بھی کرتی ہیں۔ خودنوشت ادب کی انانیتی صنف سے تعلق رکھتی ہے جس کا بنیادی مقصد کسی شخص کی تمام زندگی یا اس کے کچھ حصوں کا خود اس کے اپنے قلم سے بیان ہے۔(۶)(۷) یہ کسی شخص کی زندگی کے اہم حالات و واقعات کا تدریجی اور مرتب بیان ہوتی ہے جس میں اس شخص کی زندگی کے خارجی حالات کے ساتھ ساتھ اس کے جذبات و احساسات اور داخلی کیفیات کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔ خودنوشت نہ صرف نجی اہمیت کی حامل ہوتی ہے بلکہ اس کی ادبی، سماجی اور تاریخی اہمیت بھی مسلمہ ہے۔

''یادِ عہدِ رفتہ'' معروف نقاد ڈاکٹر عبادت بریلوی کی خودنوشت ہے جو رسالہ ''افکار'' کراچی میں قسط وار شائع ہوئی اور ۱۹۸۸ء میں ادارہ ادب و تنقید، لاہور کی طرف سے کتابی شکل میں سامنے آئی۔ ۱۶/ابواب اور ۴۰۹ صفحات پر مشتمل یہ خودنوشت نہ صرف ڈاکٹر عبادت بریلوی کی زندگی کے تمام ادوار کو ترتیب وار بیان کرتی ہے بلکہ تہذیبی، ثقافتی، تعلیمی اور تاریخی اہمیت کی حامل بھی ہے۔ خودنوشت کا پہلا باب ''پٹھانوں کی بستی'' کے عنوان سے ہے۔ پٹھانوں کی اس بستی میں بہت سے پٹھان قبائل رہتے ہیں جن میں لودھی، کانکر، دولازاق، درّانی، یوسف زئی، شیروانی اور آفریدی شامل ہیں۔ اس باب میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے پٹھانوں کے طرز معاشرت، عادات و اطوار اور تہذیب و ثقافت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ باب کا آغاز منظر کشی سے ہوتا ہے اور ڈاکٹر عبادت بریلوی نے بریلی شہر کے اختتام پر واقع سرسبز و شاداب کھیتوں، گھنے درختوں اور آم کے باغات سے گھری اس بستی کی منظر کشی ایک فطرت پرست رومانوی کے سے انداز میں کی ہے:

''خوب صورتی اور دل نشینی اس سرزمیں پر ختم تھی۔ آسمانوں سے باتیں کرنے والے اونچے

اونچے درختوں، قد آدم گھاس کے جھنڈوں، سرسبز جھاڑیوں، شاداب کھیتوں اور ہرے بھرے میدانوں نے اس سرزمین کو فطرت کے حسن کا شاہکار بنا دیا تھا۔ صبح، دوپہر اور شام کے مناظر ایسے دل کش ہوتے تھے کہ ان میں ڈوب جانے، گم ہو جانے اور کھو جانے کو جی چاہتا تھا۔ خاموشی اپنی زبان میں باتیں کرتی تھی۔ سکوت دھیمے دھیمے سروں میں نغمے گاتا تھا اور ہر وقت یہ پوری فضا نغمے گاتی اور رقص سا کرتی رہتی تھی۔''(۸)

''کچھ اپنے خاندان اور آباؤ اجداد کے بارے میں'' کے زیرِ عنوان دوسرے باب میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اپنے خاندان کا تذکرہ کیا ہے جس کا تعلق لودھی قبیلے سے تھا۔ ان کے آباؤ اجداد صدیوں پہلے افغانستان سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ اس باب میں انہوں نے اپنے آبائی مکان، اہلِ خاندان کے طرزِ زندگی، طور اطوار اور طرزِ معاشرت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس حصے میں انہوں نے اپنے خاندان کے حوالے سے دراصل پٹھانوں کی تہذیب، رہن سہن، طرزِ فکر اور طرزِ معاشرت کو بیان کیا ہے۔ اپنے آبائی مکان اور دادی کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''کھانے پینے کی چیزوں کی اس مکان میں فراوانی تھی، غلہ بھرا رہتا تھا۔ دودھ کی تو گویا نہریں سی بہتی تھیں۔ کم از کم دس بارہ بھینسیں اور گائیں پلی ہوئی تھیں۔ ان کا دودھ اتنا ہوتا تھا کہ سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا۔ دہی اور گھی گھر ہی میں تیار کیا جاتا تھا اور مہمانوں کی تواضع ہمیشہ خوب اَونٹے ہوئے سرخ سرخ بالائی والے دودھ سے کی جاتی تھی۔ دودھ کا ایک بہت بڑا بھرا ہوا پیالہ جس کو بادیہ کہتے تھے اور جس پر موٹی سی بالائی پڑی ہوتی تھی، مہمانوں کا پیش کیا جاتا تھا۔ چائے وغیرہ کا رواج نہیں تھا۔''(۹)

خودنوشت سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر عبادت بریلوی کو اپنی دادی سے بہت لگاؤ تھا۔ اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ انہوں نے تقریباً نو صفحات میں اپنی دادی کا تعارف، اخلاق و کردار، سیرت کشی، حلیہ نگاری، لباس اور طور اطوار کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان کی دادی کو اپنی اعلیٰ نسبی پر بہت فخر تھا اور وہ اکثر پشتو سے ماخوذ کچھ کہاوتیں اپنی روزمرہ گفتگو میں دہرایا کرتی تھیں جن سے ان کے اندازِ فکر اور نظریہ حیات کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ان کا تعارف کراتے ہوئے محض چند الفاظ میں ہی ان کی شخصیت کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ ان کا ناک نقشہ قاری کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے:

''گول چہرہ، میانہ قد، سرخ سفید چمپئی رنگ، چاندی کی طرح سفید بال، چہرے پر جھریاں لیکن آواز میں گھن گرج کی کیفیت، سخت مزاج، بے باک، نڈر، ایماندار، سچ کی پرستار، ملنسار، مہمان نواز، ہمدرد، دوستوں کی دوست اور دشمنوں کی دشمن، سونے کا نوالہ کھلانے والی لیکن شیر کی آنکھ سے دیکھنے والی، شفقت اور محبت کا ایک اٹھتا ہوا سمندر، قوت ارادی کا پیکر، اور فکر و عمل کے اعتبار سے ایک آندھی، ایک طوفان! یہ تھیں ہماری دادی اماں!''(۱۰)

خودنوشت کا تیسرا باب ''شہر بریلی کی کچھ یادیں'' تہذیبی ومعاشرتی حوالے سے نہایت اہم اور دلچسپ ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے بریلی شہر میں لوگوں کی معاشرت کے انداز، رسوم ورواج، عقاید، توہمات، سفر کرنے کے انداز، محرم کی رسوم، میلاد کی محفلوں، گیارھویں شریف کی نیازوں، اہلیانِ بریلی کے پسندیدہ کھانوں، میلے ٹھیلوں اور شادی بیاہ کی رسموں پر تفصیلاً روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کا کمال یہ ہے کہ وہ ذاتی حالات وواقعات کے ضمن میں ہی اپنے ماحول کا تفصیلی تعارف پیش کر دیتے ہیں اور وہ بھی اس قدر جزئیات کے ساتھ کہ ایک عہد کی مکمل تصویر قاری کے سامنے آ جاتی ہے۔ ''یادِ عہدِ رفتہ'' کی اس خوبی کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر حسن وقار گل رقم طراز ہیں:

> ''فرد کی زندگی کے پس منظر میں مکمل ماحول کی ادیبانہ موثر انداز میں پیش کش کے لحاظ سے یہ منفرد اور قابلِ تحسین کوشش ہے۔ سوانح عمریاں اس طرح نہیں لکھنا چاہئیں کہ صرف فرد کے حالات بیان ہوں کیونکہ فرد ایک خاندان اور معاشرے کا حصہ ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت ان کے اثرات کو قبول کرتی ہے اور ان پر اثر انداز بھی ہوتی ہے۔ اس لیے جب تک یہ پس منظر واضح نہ ہو، تصویر واضح نہیں ہو سکتی۔ مصنف نے اس تکنیک کو کامیابی سے برتا ہے۔ وہ جزئیات نگاری برائے جزئیات نگاری نہیں کرتے بلکہ ان جزئیات کا اپنی ذات سے رشتہ باقی رکھتے ہیں۔ یہی اس کی نمایاں خوبی ہے۔ سوانح نگاری کی مذکورہ تکنیک کے اس اعتبار سے اس سے زیادہ کامیاب سوانح عمری اردو میں کوئی دوسری نہیں ملے گی۔''(۱۱)

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے والدین ان کے بچپن ہی میں ان کی تعلیم کی خاطر بریلی سے لکھنؤ آ گئے تھے لہٰذا خودنوشت کے چوتھے باب بعنوان ''لکھنؤ'' میں انھوں نے لکھنؤ کی زوال پذیر معاشرت کے تمام تر اچھے اور برے پہلوؤں کو بیان کیا ہے۔ ان میں لکھنؤ کی پتنگ بازی بھی ہے اور بٹیروں کی پالیاں بھی، رکاب گنج کے بازار میں دیوالی کا جشن بھی ہے اور گلیوں میں روضہ رسول ﷺ کی شبیہ اُٹھا کر گھومنے والی روضہ والیاں بھی، غریب مسلمانوں کو خون چوسنے والا للّو مہاجن بھی ہے اور اپنی ساری دولت ''ریس'' میں لٹانے والا رئیس رسول بخش بھی، خسیس طبیعت کے مالک بنّے صاحب بھی ہیں اور سفید پوشی میں اپنی نوابانہ فیاضی کو نبھانے والے نواب مصطفیٰ خان بھی، لکھنؤ کے محرم اور چہلم کی تفاصیل بھی ہیں اور محمود آباد کی چھوٹی رانی اور ۸ ربیع الاول کے ''چپ تعزیہ'' کا احوال بھی۔ غرض ان چونتیس صفحات میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے لکھنؤ کے مٹتے ہوئے تمدن اور مضبوط روایات پر قائم کھوکھلی معاشرت کے سب پہلوؤں کو ان کی تمام تر جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے:

> ''اس آبادی میں، عہدِ نوابی کی خصوصیات ابھی تک زندہ تھیں اور ابھی تک وہی طور طریقے برتے جاتے تھے جن کا نوابوں کے زمانے میں رواج تھا۔ مثلاً جب بھی حکومت اور انتظامیہ عوام تک کوئی اطلاع پہنچانا چاہتی تھی تو ڈھنڈورہ پٹتا تھا، ایک شخص زور زور سے

ڈھول پیٹتا ہوا آتا تھا اور جگہ جگہ ٹھہر کر اس طرح آواز لگاتا تھا۔ ''خلق خدا کا، ملک ہندوستان کا، حکم ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کا، ہر خاص و عام کو اطلاع دی جاتی ہے کہ دفعہ ۱۴۴ لگا دی گئی ہے، اور چار سے زیادہ لوگوں کا ایک جگہ جمع ہونا ممنوع ہے۔'' ہر حکم کا اعلان اسی طرح ہوتا تھا اور لوگ اس اعلان کو بڑی توجہ سے سنتے تھے۔''(۱۲)

ایک زمانے تک ہندوستان کے شرفا اور عوام کا محبوب مشغلہ کبوتر بازی اور بٹیر بازی رہا ہے۔ زمانۂ زوال میں ان مشاغل کو عین حیات کا درجہ دے دیا گیا اور لکھنؤ میں تو بڑے بڑے نواب اپنا سارا سارا دن اسی مشغلے میں صرف کرنے لگے۔ کبوتروں، بٹیروں اور تیتروں کی پالیاں ہی نہیں جمتیں تھیں بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ ان مشاغل پر جوا بھی کھیلا جانے لگا۔ تاہم عوام میں یہ بے ضرر مشاغل بے حد مقبول تھے اور ان کی مقبولیت تمام ہندوستان میں یکساں تھی۔ چونکہ ہندوستان کے دور زوال میں لکھنؤ اس زوال پذیر تہذیب کی آخری شمع بن کر چمکا، لہذا ہر تہذیبی پہلو لکھنؤ کی صورت میں مٹنے سے پہلے ایک بار یہاں کی زندگی میں اپنی بھرپور صورت میں نمایاں ہوا اور لکھنؤ کی پہچان بن کر ابھرا۔ خودنوشت سے پتہ چلتا ہے کہ لکھنؤ میں ہندوستان کے دیگر شہروں کی طرح کبوتر بازی اور بٹیر بازی ایک مشغلہ ہی نہیں بلکہ مقصد حیات بن کر رہ گیا تھا۔ لہٰذا لکھنؤ میں جگہ جگہ بٹیروں کی پالیاں جمتی تھیں جن پر خوب وقت برباد کیا جاتا تھا۔ یہاں بٹیروں کو پالیوں کے لیے تیار کرنے کا اپنا ایک خاص انداز تھا اور اس کے لیے رات کو بٹیروں کو کانوں میں ''کوکا'' جاتا تھا۔ اس بارے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی اپنے مشاہدات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''رات کو ہمارے گھر کے آس پاس عجیب طرح کا شور ہوتا تھا اور چیخوں کی خوفناک آوازیں کئی کئی گھنٹوں تک مسلسل آتی رہتی تھیں۔۔۔ لیکن دریافت کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ آس پاس کے محلوں میں دور دور تک جو لوگ بٹیریں پالتے ہیں اور انہیں پالی کے لیے تیار کرتے ہیں، وہ رات کو ان بٹیروں کے کانوں میں زور زور سے آوازیں نکالتے ہیں (لکھنؤ کی اصطلاح میں کوکتے ہیں) تاکہ ان بٹیروں کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں اور وہ بہرے ہو جائیں، اس لیے کہ جب پالی کے موقع پر لڑیں تو انہیں کوئی آواز سنائی نہ دے، صرف لڑائی میں مصروف رہیں۔ پالی کے موقع پر جب بٹیر لڑتے تھے تو دونوں طرف کے آدمی اس قدر شور مچاتے تھے کہ پالی اچھا خاصا میدان کارزار بن جاتی تھی۔ بٹیر اس شور سے گھبراتے تھے، اس لیے پالنے والے راتوں کو ''کوکنے'' کی عجیب و غریب آوازیں نکال کر انہیں بہرہ کر دیتے تھے۔ کیسے عجیب لوگ تھے اور ان کا یہ رویہ بھی کتنا عجیب تھا!''(۱۳)

اس زمانے میں غلیل بازی اور بنوٹ بازی ایسے مشاغل تھے جنہیں سیکھنا لازمی سمجھا جاتا تھا۔ یہ دراصل اس زمانے میں مسلمانوں کے دفاع کا ایک انداز تھا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے مطابق عوامی مشاغل میں لاٹھی اور غلیل کا استعمال ایک طرح کی سماجی ضرورت بھی تھی کہ ہندوستان کے زرعی معاشرے

میں چھوٹے موٹے جھگڑے نبٹانے میں یہی لاٹھیاں بطور ہتھیار استعمال کی جاتی تھیں۔لکھنؤ میں چونکہ نمود ونمائش کا جذبہ زندگی کی بنیادی قدر کا درجہ اختیار کر گیا تھا اس لیے بعض شوقین حضرات نمود نمائش کی خاطر ان لاٹھیوں کی تزئین وآرائش پر بھی خوب پیسہ خرچ کرتے تھے:

''بندوق اور تلوار چھن جانے کے بعد لوگوں کے ہاتھوں میں لاٹھی اور غلیل آ گئی تھی اور ان دونوں کو مختلف حالات میں استعمال کرنا ان لوگوں کا محبوب مشغلہ رہ گیا تھا۔ ہر پٹھان کے ہاتھ میں لاٹھی ضرور ہوتی تھی۔ ہر بچہ اور جوان اپنے پاس غلیل ضرور رکھتا تھا۔۔۔لاٹھیوں کو بڑے اہتمام سے تیار کیا جاتا تھا۔کڑوا تیل اس پر اتنا لگاتے تھے کہ وہ سیاہ ہو جاتی تھیں۔بعض لوگ ان لاٹھیوں کی آرائش وزیبائش بھی کرتے تھے۔لاٹھیوں کی شامیں بنانے میں بڑا اہتمام کیا جاتا تھا۔بعض لوگ ان شاموں کے اوپر پیتل کی بنی ہوئی پھلّیاں بھی لگا لیتے تھے،لیکن ایسا کم ہوتا تھا،صرف چند شوقین لوگ ایسا کرتے تھے۔جھگڑے فساد کے موقع پر جب لاٹھی چلتی تھی تو اس کو فوج داری کہا جاتا تھا۔مثلاً اس طرح کہتے تھے کہ فلاں جگہ فوج داری ہوگئی ہے،یعنی جھگڑا فساد ہو گیا ہے۔''(۱۴)

اس باب میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے لکھنؤ کے ''کبڑّیوں'' کا ذکر بھی تفصیل کے ساتھ کیا ہے جو بہت دلچسپ اور مبنی بر معلومات ہے۔ان کے مطابق ان کے محلہ یعنی ڈیوڑھی آغا میر کے بازار میں کبڑّیوں کے کئی خاندان آباد تھے۔یہ لوگ باقاعدہ گھر نہیں بناتے تھے اور اپنی دکانوں میں ہی رہتے تھے،سبزی ترکاری اور پھل بیچنے کے علاوہ کوئی اور کام یا کاروبار نہیں کرتے تھے۔عقاید کے اعتبار سے یہ لوگ کٹّر قسم کے سنّی تھے۔مرد شلوار کرتا پہنتے یا تہبند باندھتے تھے اور عورتیں زیادہ تر لہنگا پہنتی تھیں جوان کے خوب صورت اور سڈول جسموں پر خوب جچتا تھا۔ان کی عورتیں عموماً کم گو اور مرد بہت چرب زبان ہوتے تھے جو نہایت شستہ گفتگو کرتے اور مخاطب سے بات کے دوران حفظ مراتب کا خیال رکھتے تھے۔ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ان کی معاشرت اور تہذیب وثقافت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔مثال کے طور پر کبڑیوں کی شادی میں پیش کیے جانے والے کھانوں کے بارے میں بتاتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''چھوٹی عمر میں یہ لوگ اپنی لڑکیوں کی شادی کر دیتے تھے۔شادیوں کے موقع پر یہ لوگ خاص قسم کے کھانے پکاتے تھے۔پلاؤ اور بریانی وغیرہ پکوانے کا رواج ان کے ہاں نہیں تھا۔صرف مونگ اور سادے چاول پکتے تھے اور برات کو یہی کھانا پیش کیا جاتا تھا،لیکن ایسے لذیذ ہوتے تھے کہ بریانی اور پلاؤ کو مات کرتے تھے۔مختلف مسالوں کے علاوہ دودھ، بالائی،گھی اور نجانے کیا کیا کچھ ان میں ڈالا جاتا تھا اور سادے چاولوں سے ایسی مہک نکلتی تھی کہ دور دور تک لوگوں کو علم ہو جاتا تھا کہ کسی کبڑّن کی شادی میں خاص کھانا پک رہا

ہے۔"(۱۵)

اوہام پرستی ہندوستانی تہذیب کے لازمی جزو کا درجہ رکھتی ہے۔ اوہام پرستی کے ضمن میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات کی قدرت، فرشتوں کے وجود اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے اختیارات پر ایمان، جنات کو اللہ کی ایک مخلوق سمجھنا، انبیائے کرامؑ، شہدائے کرامؓ، صادقین و صالحین اور اولیا و صوفیائے کرامؒ کی روحانی عظمت کو تسلیم کرنا اسلامی عقاید میں شامل ہے۔ ان پر اعتقاد سے عوام کا مذہب سے گہرے لگاؤ کا اندازہ ہوتا ہے۔ البتہ اسلامی تہذیب کے طویل ترین ارتقا نے ان عقاید پر متنوّع تہذیبوں کے اثرات مرتب کیے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی اپنے بچپن کی یادوں کو دہراتے ہوئے اس زمانے کے اوہام کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "میرے بچپن میں گنڈے تعویذوں کا بڑا زور تھا، جس گھر میں جاؤ تعویذ گھل رہے ہیں، سیئی کے کانٹوں کا ذکر ہو رہا ہے اور لوگ کہہ رہے ہیں کہ تکیے کے نیچے سے یہ کانٹے نکلے ہیں۔ کہیں خون سے بھری ہوئی کوئی ہنڈیا گھر میں آکر گر رہی ہے۔ کوئی بنگالی مولوی کتھا چونا لگے ہوئے پان کو سامنے رکھ کر گھر والوں کو کسی دوسرے گھر میں ہونے والے واقعات کی تصویریں دکھا رہا ہے۔ کہیں کسی جانور کا کٹا ہوا سر گھر میں آکر گر رہا ہے وغیرہ وغیرہ ہے"(۱۶)

کسی بھی معاشرے کی تہذیب کی داخلی جہت کی بنیاد کچھ مثبت اور منفی اقدار، اوامر و نواہی اور پسند و ناپسند کے معیاروں پر قائم ہوتی ہے جن کا منبع و ماخذ اس قوم کے بنیادی عقاید اور تصورِ حقیقت پر ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں کسی قوم کے مذہبی عقاید اور تصورات ہی اس قوم کی تہذیب کی بنیاد ہوتے ہیں۔ مذہب سے لگاؤ ہندستانی کا لازمی جزو ہے اور مذہبی عبادات اور رسوم کی پابندی مذہبی عقاید پر اذہان کی مضبوط گرفت کی عکاسی کرتی ہے۔ اہلِ بیتؓ اور حضرت امام حسینؓ سے محبت تمام اہلِ اسلام کا جزوِ ایمان ہے اور واقعہ کربلا کے حوالے سے مظلوم سے ہمدردی اور ظالم سے نفرت، باطل کے مقابلے میں حق کی فتح و کامرانی کا یقینِ محکم اور شہدا کا احترام اسلامی تہذیب کا لازمی اور اولین حصہ ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے بریلی میں محرم منانے کے انداز اور رسومات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان کے مطابق سنّی اکثریت کا شہر ہونے کے باوجود بریلی میں محرم پورے مذہبی جوش و خروش اور عقیدت سے منایا جاتا تھا، شہر کے مختلف علاقوں سے تعزیے نکالے جاتے، شیعوں کی طرح، نوحہ سوزی، مرثیہ خوانی، ماتم اور سینہ کوبی تو نہیں کی جاتی تھی البتہ ان سب کے عوض، ڈھول اور تاشے بجائے جاتے اور پٹّے بازی اور مختلف کرتبوں کا مظاہرہ کیا جاتا، رنگ برنگے بٹوؤں میں، گوٹہ تقسیم کیا جاتا، کھچڑا پکایا جاتا، نذر نیازیں پکائیں جاتیں، سبیلیں لگائی جاتیں، گھروں میں شہادت نامے پڑھنے کی محفلیں منعقد ہوتیں اور چہلم تک سوگ منایا جاتا۔ اس سے امام حسینؓ اور شہدائے کربلاؓ سے محبت اور عقیدت کے ساتھ ساتھ اس

بات کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ اس دور میں سنّی اور شیعہ کلچر میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا اور رواداری اس دور کے مسلمانوں کا طرۂ امتیاز تھا۔ علاوہ ازیں شیعہ کلچر کی رسوم میں اتنی کشش اور جاذبیت تھی کہ سنّی حضرات بھی انہیں اپنانے میں خوشی اور تسکین محسوس کرتے تھے اور فرقہ وارانہ اور مسلکی حدود میں کافی لچک موجود تھی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

''اس زمانے میں بریلی شہر میں محرم بڑے زور وشور سے منایا جاتا تھا۔ شیشم کی مضبوط اور جاندار لکڑی کے تعزیئے بنائے جاتے تھے جن کو بریلی کی اصطلاح میں ''تخت'' کہتے تھے۔ ان کا جلوس محرم کی ساتویں اور نویں تاریخ کو شہر کے مختلف علاقوں سے نکالا جاتا تھا۔ یہ تخت اور تعزیئے خوب سجائے جاتے تھے۔ رنگ برنگی روشنیوں اور طرح طرح کے رنگوں سے انہیں مزیّن کیا جاتا تھا۔ ان کے سامنے ڈھول اور تاشے بجائے جاتے تھے، پٹّے بازی کا مظاہرہ ہوتا تھا اور جواں مردی کے کرتب دکھائے جاتے تھے۔ نوحے اور مرثیے نہیں پڑھے جاتے تھے، ماتم بھی نہیں ہوتا تھا، کیونکہ یہ تمام تعزیے اور تخت سنّیوں کے تھے اور سنّیوں کے ہاں ماتم یا سینہ کوبی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ تعزیوں کے ساتھ اس زمانے میں ایک عورت سلیمن نامی، سبز رنگ کا لباس، تنگ پاجامہ اور قمیض پہن کر ضرور چلتی تھی۔ یہ لمبے قد کی موٹی عورت تھی، رنگ سیاہ تھا، گلا پھولا ہوا تھا۔ اس پھولے ہوئے گلے میں وہ بہت سے ہار ڈال لیتی تھی اور تعزیوں کے جلوس میں شریک ہوتی تھی۔ پٹّے بازوں کے آگے آگے چلتی تھی اور کچھ پڑھتی جاتی تھی۔ اسے بچے اور نوجوان لڑکے چھیڑتے بھی تھے، جس دن کوئی نہیں چھیڑتا تھا تو کہتی تھی ''آج سب مر گئے، کہاں چلے گئے؟''۔۔۔ عشرے کے دن ہمارے گھروں میں توا نہیں چڑھتا تھا، روٹی نہیں پکتی تھی، صرف چاول پکا لیے جاتے تھے۔ محرم کی تقریبات کا سلسلہ چہلم تک کسی نہ کسی صورت میں ضرور جاری رہتا تھا۔ اس عرصے میں کوئی شادی نہیں ہوتی تھی، ہمیشہ چہلم یعنی ۲۰ صفر کے بعد شادیوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔''(۱۸)

سلطنت اودھ و لکھنؤ کے حکمرانوں کا تعلق سلاطین صفویہ سے تھا جو اثنا عشری شیعہ تھے۔ انہیں کے اثرات کی بدولت لکھنوی تہذیب میں شیعیت کے اثرات اور عناصر ہندوستان کے دوسرے شہروں کی نسبت زیادہ رہے ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کا بچپن اور لڑکپن لکھنؤ میں گزرا اس لیے انہوں نے لکھنؤ کے تہذیبی و معاشرتی پہلوؤں کا بغور جائزہ لیا ہے اور انہیں اپنی خودنوشت میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ لکھنؤ میں ویسے تو محرم کو بطور خاص جوش وخروش سے منایا جاتا تھا مگر ان کے محلے ڈیوڑھی آغا میر میں دور ونزدیک تک شیعہ آبادی کی کثرت تھی اس لیے وہاں محرم کی تقریبات زیادہ شدت سے منائی جاتی تھیں۔ چونکہ انہیں لکھنؤ میں محرم کی تمام تقاریب کا نہایت قریب سے مشاہدے کرنے کا موقع ملا اس لیے خودنوشت میں انہوں نے محرم کی ان محفلوں کو اس کی مکمل جزئیات کے ساتھ اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ

قاری خود کو اہل لکھنؤ کے ساتھ ان تمام تقاریب اور تعزیے کے جلوسوں کے ہمراہ چلتا پھرتا محسوس کرتا ہے:

''محرم سے ان کی دلچسپی حضرت امام حسینؓ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی محرم ان کے لیے اپنے گناہوں کو معاف کروانے کا ایک ذریعہ اور وسیلہ بھی تھا۔ یکم محرم سے شروع ہو کر ۸ ربیع الاول تک محرم کی تقریبات کا سلسلہ مختلف صورتوں میں جاری رہتا تھا۔ ویسے شبیہیں تو ۱۷ رمضان ہی سے لگ جاتی تھیں اور اس طرح محرم کا آغاز ہو جاتا تھا۔ کسی نہ کسی تقریب سے مجلسیں ہوتی رہتی تھیں۔ محرم کی تقریبات کا زور یکم محرم سے ہوتا تھا۔ عشرے اور تیجے تک تو لکھنؤ میں اتنی مجلسیں ہوتی تھیں کہ ان کا شمار مشکل ہے۔ ہر گھر میں مجلس، ہر گھر میں ماتم، ہر گھر میں تعزیہ، ہر گھر میں مہندی، ہر گھر میں مرثیہ خوانی اور سوز خوانی۔ لوگ سیاہ کپڑے پہنے، جوق در جوق سڑکوں پر ادھر ادھر آتے جاتے نظر آتے تھے۔ ذکر امام مظلومؓ کا ہر گھر میں ہوتا تھا۔ بہت سے لوگ اس زمانے میں پان کھانا چھوڑ دیتے تھے۔ کچھ لوگ کپڑے تبدیل نہیں کرتے تھے۔ بعضے ننگے پاؤں اور ننگے سر رہتے تھے۔ غرض یہ کہ ہر طرح سے شہدائے کربلا کے ساتھ عقیدت اور محبت کا اظہار ہوتا تھا۔''(۱۹)

محمود آباد کی چھوٹی رانی کا تعزیہ لکھنؤ کی ایک خاص روایت تھی اور اس کی ایک اپنی شان تھی۔ اس کے ذکر کے بغیر لکھنؤ کا محرم ادھورا ادھورا سا لگتا ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

''محمود آباد کی چھوٹی رانی کا تعزیہ ان تقریبات کی ایک اہم کڑی تھی۔ چہلم کے دن یہ تعزیہ نہایت اہتمام سے اٹھایا جاتا تھا۔ اس جلوس میں نوحہ خوانوں اور سوز خوانوں کے ساتھ بڑی تعداد میں ہاتھی، گھوڑے اور اونٹ وغیرہ بھی ہوتے تھے جن پر ہاتھوں میں علَم لے کر لوگ بیٹھتے تھے اور کچھ پڑھتے جاتے تھے۔ کوئی میل بھر لمبا جلوس ضرور ہوتا ہوگا۔ خلقت اس جلوس کو دیکھنے کے لیے ہمارے محلے میں خاص طور پر جمع ہوتی تھی۔ جشن کا سا سماں ہوتا تھا۔ بیشتر لوگ تفریح کے خیال سے اس جلوس کو دیکھنے کے لیے جمع ہوتے تھے۔''(۲۰)

۸ ربیع الاول کو نکالے جانے والے لکھنؤ کے معروف چپ تعزیئے کی بھی ایک اپنی تہذیبی و ثقافتی اہمیت ہے۔ اس کا بیان بھی دلچسپی سے خارج نہیں ہے:

''اور ۸ ربیع الاول کو چپ تعزیہ نکلتا تھا۔ اس میں ہزار ہا آدمی شریک ہوتے تھے لیکن سب ننگے سر چپ چاپ، خاموش جلوس میں چلتے تھے۔ ایک نقیب کچھ واقعات بیان کرتا جاتا تھا ۔لوگ خاموشی کے ساتھ گریہ کرتے تھے۔ چوک کی لمبی سڑک پر اس جلوس کا منظر دیکھنے والوں کو بہت متاثر کرتا تھا اور ہزار ہا لوگ اس کو دیکھنے کے لیے دور دور سے آتے تھے۔''(۲۱)

۸ ربیع الاول کے چپ تعزیے کے بعد ۹ ربیع الاول کو اہلِ تشیع ''عید غدیر'' مناتے ہیں

۔اس موقع پر اہل لکھنؤ بطور خاص خوشی مناتے اور خوب رونق ہوتی ۔اس بارے میں بات کرتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اس تہوار کو منانے کی روایت کا پس منظر بھی بیان کیا ہے:

''۹ ربیع الاول کو محرم کا ماحول اچانک ختم ہو جاتا تھا اور عزاداری اور سوگواری کی جگہ مسرت اور شادمانی لے لیتی تھی۔ سیاہ اور سبز پوشاکیں اتر جاتی تھیں اور اس کی جگہ سرخ اور گلابی رنگ کے لباس لے لیتے تھے۔لوگ ہنستے بولتے، خوشیاں مناتے، تفریح کرتے اور سڑکوں اور گلیوں میں اجلے گھلے پھرتے تھے۔ یہ تقریب تہوار کی طرح منائی جاتی تھی اور اس کو لکھنؤ کی اصطلاح میں ''عیدِ غدیر'' کہتے تھے۔ میں نے جب کئی بار اس کے بارے اپنے نوجوان ساتھیوں میاں جانی، فرخ آغا اور چھوٹے نواب سے پوچھا تو مجھے ایک ہی جواب ملا کہ شہدائے کربلا میں سے جو زندہ سلامت رہ گئے تھے انہوں نے خواب دیکھا کہ تمام شہدا جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام پر ہیں۔انہیں بشارت ہوئی کہ خوش ہونا چاہیے۔اس لیے یہ مسرت وشادمانی کا دن منایا جاتا ہے اور اس کو عید غدیر کہتے ہیں۔''(۲۲)

اسلامی تہذیب میں خانقاہوں، درگاہوں اور صوفیا کا بھی ایک اہم مقام ہے اور ان سے عقیدت اور محبت کی جڑیں عوام کے دل میں نہایت گہری ہیں۔ یہ صوفیا تبلیغ اسلام کے لیے مختلف ممالک سے برصغیر میں آئے اور مختلف علاقوں میں پھیل گئے۔ درویش منش، سادہ اور پاک طینت یہ صوفیائے کرام پڑھے لکھے اور صاحب تقویٰ بزرگ تھے جن کا مقصد اسلام کی تبلیغ اور مسلک انسان سے محبت تھا۔ان کا تعلق سلطانوں اور بادشاہوں کی بجائے عوام سے تھا اور ان کے مخاطب بھی بادشاہ یا درباری نہیں بلکہ عوام تھے۔ان بزرگوں کی اپنی زندگیاں محبت، سادگی، رواداری، انسانی ہمدردی، مساوات، خلوص اور تقویٰ کا نمونہ تھیں۔تکلفات سے پاک ان کی زندگیوں کے نمونوں نے ایسے طرز زندگی کو پیش کیا جس میں باطن کی صفائی اور عمل کی پاکیزگی بنیادی جزو تھا۔یہی وجہ ہے کہ وہ بہت جلد عوام میں مقبول ہو گئے اور ان کی تعلیمات کی بدولت ہی برصغیر کے عوام اسلام کی طرف راغب ہوئے۔مسلمان ہی نہیں غیر مسلم بھی ان صوفیا سے متاثر ہیں اور ان سے محبت اور عقیدت رکھتے ہیں۔ ہندوستان میں ان اولیا کے مزاروں پر ہر روز لاکھوں زائرین بلاتفریق مذہب وملت حاضر ہوتے ہیں اور وہاں مانگی جانے والی دعا کی قبولیت اور صاحب درگاہ کی کرامات پر یقین رکھتے ہیں۔مزاروں پر حاضری دینا، منتیں مانگنا اور چڑھاوے چڑھانا، درباروں پر تقسیم ہونے والے لنگر کو ''تبرک''سمجھنا اور دنیاوی معاملات ومسائل میں صاحب مزار کے تصرفات پر ایمان رکھنا ایسے تہذیبی عقاید ہیں جن پر ان پڑھ اور سادہ لوح عوام ہی نہیں بلکہ اچھے خاصے پڑھے لکھے افراد بھی کامل یقین رکھتے ہیں۔ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھنؤ کے مشہور بزرگ حضرت شاہ میناؒ صاحب کے مزار کے بارے میں لکھتے ہیں:

''والد صاحب روزانہ حضرت مخدوم شاہ مینا صاحبؒ کے مزار پر حاضری دیتے تھے اور دیر

تک وہاں بیٹھ کر اور دعائیں مانگ کر رات گئے گھر واپس آتے تھے۔ حضرت مخدوم شاہ مینا صاحبؒ عہد مغلیہ کے بہت بڑے صوفی بزرگ تھے جن کی درگاہ پر ہندو اور مسلمان سب ہی جاتے اور دعائیں مانگتے تھے۔ ہم لوگوں پر ان کا خاص کرم تھا، اس لیے ایک ڈھارس سی رہتی تھی۔ میں خود بھی اکثر شاہ صاحب کے مزار پر حاضری دیا کرتا تھا۔ جمعرات کو مزار پر بڑی رونق ہوتی تھی۔ بسنت کے تہوار کے موقع پر بھی مزار پر جشن ہوتا تھا۔ ہزارہا لوگ ہندو اور مسلمان جوق در جوق آتے تھے اور فاتحہ پڑھتے اور دعائیں مانگتے تھے۔ عرس کے موقع پر تین دن تک قل ہوتا تھا۔ چنے کی دال اور خمیری روٹی تبرک کے طور پر تقسیم ہوتی تھی۔ صبح سے شام تک سماع کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ہم سب بڑی عقیدت سے ان تقریبات میں شریک ہوتے تھے اور ہم سب کا عقیدہ تھا کہ شاہ مینا صاحبؒ لکھنؤ کے قطب ہیں اور ان کی اجازت کے بغیر یہاں کچھ نہیں ہوسکتا اور تجربے نے یہ بتایا کہ یہ سب کچھ صحیح تھا۔''(۲۳)

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے مطابق تقسیم ہند کے بعد جب ہندو مسلم فسادات نے پورے برصغیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا تو لکھنؤ کا ماحول قدرے پر امن ہی رہا۔ پھر شر پسندوں نے لکھنؤ کے امن کو تباہ کرنے کا ایک ناپاک منصوبہ بنایا اور حضرت مینا شاہؒ کی درگاہ پر بم پھینکا جو صاحب درگاہ کی کرامت سے بجھ گیا۔ اس واقعے کا آنکھوں دیکھا حال سناتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں کہ اس واقعے کے بعد لکھنؤ کی فضا مزید بہتر ہوگئی اور ہندوؤں تک نے اس واقعے کی مذمت کی۔ اس کے بعد ہندوستان کے تمام علاقوں سے فسادات کی خبریں آتی رہیں مگر لکھنؤ ان فسادات سے محفوظ رہا۔(۲۴) خود نوشت میں ایسے واقعات کا اس قدر عقیدت سے بیان ڈاکٹر عبادت بریلوی کے مذہب سے لگاؤ کو ظاہر کرتا ہے۔

بعض بزرگوں کے تقویٰ، نیکی و پارسائی اور عبادت گزاری کے بعد انہیں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو جاتا ہے اور ان کی زبان میں تاثیر اور دعا میں قبولیت آجاتی ہے۔ ایسے بزرگوں کو عام طور پر ''ولی اللہ''، ''پیر'' اور ''پہنچے ہوئے بزرگ'' کہا جاتا ہے۔ ان صوفیا، اولیا اور بزرگوں سے عجیب و غریب روایات منسوب ہوجاتی ہیں ہیں اور عوام ان روایات اور کرشموں پر مکمل طور پر یقین رکھتی ہے۔ تصوف اور ولایت کی رو سے ان بزرگوں کے مختلف درجے ہوتے ہیں اور ان مجذوب یا ولی اللہ حضرات کی عجیب و غریب عادات ہوتی ہیں جنہیں کرشمہ بھی کہہ سکتے ہیں اور کرامت بھی۔ ایسے لوگوں کو ولی اللہ سمجھا جاتا ہے اور ان کی تکریم کی جاتی ہے۔ لوگ ان کی خدمت کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں اور ان کی ناراضی سے ڈرتے ہیں۔ ان اولیائے اللہ اور صوفی بزرگوں کی عزت و احترام بھی ہماری تہذیب کا خاصہ ہے۔ اسی طرح معاشرے میں مجذوب لوگوں کا بھی احترام کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی بتاتے ہیں کہ ان کی والدہ کو بھی 'بعض پہنچے ہوئے بزرگوں' سے عقیدت تھی۔ ان بزرگوں میں ایک مقبول میاںؒ بھی تھے جن کے پاس ان کی والدہ دعا کے لیے جایا کرتی تھیں۔ مقبول میاں کی کرامات بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان میں سے ایک بزرگ خیر آباد والے مقبول میاںؒ بھی تھے۔ مقبول میاں پر اکثر اوقات جذب کا سا عالم طاری رہتا تھا۔ صرف جمعے کے دن وہ کسی قدر ہوش میں آتے تھے۔ نہاتے دھوتے اور وضو کرتے اور کپڑے بدل کر جمعے کی نماز کے لیے مسجد میں جایا کرتے تھے ۔اس علاقے میں دور دور تک لوگوں کو اس بات کا علم تھا کہ عالم جذب میں ہونے کی وجہ سے جو کچھ ان کے منہ سے نکل جاتا تھا وہ ہو جاتا تھا۔''(۲۵)

ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں کہ ان کی والدہ کو بڑا شوق تھا کہ ان کا بیٹا پڑھ لکھ کر کلکٹر یا ڈپٹی کمشنر ہو جائے اور وہ اس مقصد کے لیے دعا کرانے لکھنؤ سے خیر آباد مقبول میاں کے پاس گئیں اور اپنا مدعا بیان کیا۔ مگر میاں نے ان کی بات سن کر تین بار صرف یہ کہا کہ کالج کی نوکری بہت اچھی اور پھر حالات نے ثابت کیا کہ ان کے لیے کالج کی نوکری ہی عزت اور کامیابی کا وسیلہ بنی۔ (۲۶)

خودنوشت کے تین ابواب میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے امین آباد ہائی اسکول لکھنؤ، گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ اور لکھنؤ یونیورسٹی میں اپنے زمانہ طالبِ علمی کو یادوں کو تازہ کیا ہے۔ انہوں نے اپنے اساتذہ کا حلیہ، لباس اور عادات واطوار کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے اور اپنے اساتذہ کا ذکر اس محبت اور احترام کے ساتھ کیا ہے کہ ان کے چھوٹے چھوٹے خاکے صفحۂ قرطاس پر بکھر گئے ہیں۔ شخصیت کی تصویر کشی میں وہ اس کے ظاہری خدوخال کے علاوہ اس کے لباس اور عادات واطوار کو بھی جزئیات کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ جزئیات نگاری کی یہ خوبی خاص طور پر ان کے اسکول کے اساتذہ، ایچ۔ ڈی گھوش، ثاقب حسین اور مولانا اختر تلہری اور کالج کے اساتذہ، پنڈت جھاؤ لال، ایچ۔ کے۔ بینر جی، پروفیسر حامد اللہ افسرؔ، یونیورسٹی کے اساتذہ، رستوگی صاحب، ڈاکٹر رام بلاس شرما صاحب، احمد علی، پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیبؔ، مولانا محمد حسین صاحب اور پروفیسر سید احتشام حسین کے ضمن میں نظر آتی ہے اور اس کمال کے ساتھ کہ ان اساتذہ کی شخصیت اور کردار کا نقش قاری کے ذہن میں قائم ہو جاتا ہے۔ حلیہ نگاری کے ضمن میں وہ لباس کی تمام تفصیل بھی بیان کر دیتے ہیں جس سے وہ شخصیت اپنے مخصوص ماحول میں اپنے تمام ثقافتی خصائص کے ساتھ چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ پروفیسر اے۔ پی ۔بینر جی کا حلیہ ملاحظہ فرمائیں، ڈاکٹر عبادت بریلوی کی یادداشت کے ساتھ ساتھ مشاہدے کی باریک بینی بھی نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے:

''میانہ قد، سرخ وسفید رنگ، بھرے بھرے گال، اس پر گچھی ہوئی سفید داڑھی، بنگالی کرتے اور دھوتی میں ملبوس۔ یہ تھے پروفیسر اے۔ پی۔ بینر جی۔ ہمیشہ سفید براق کپڑے پہنتے تھے۔ کرتے کی آستینیں بہت ڈھیلی ڈھالی اور خاصی لمبی ہوتی تھیں جن کو وہ اپنی کہنیوں تک دہرا کر لیتے تھے، جاڑوں میں وہ بند گلے کا کوٹ اور پتلون پہنا کرتے تھے اور اس لباس میں ان کا چمپئی رنگ کچھ اور بھی دمکتا تھا۔''(۲۷)

خودنوشت میں اس عہد کی تاریخ بھی لحہ بہ لحہ صفحۂ قرطاس پر بکھری ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ چونکہ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اس دور کے سیاسی خلفشار کو ایک بچے کی آنکھ سے دیکھا تھا لہٰذا ان کے بچپن کی یادوں میں تحریکِ خلافت اور سائمن کمیشن کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ مگر تقسیم برصغیر کے وقت ڈاکٹر عبادت بریلوی اینگلو عربک کالج دہلی میں درس وتدریس کے شعبے سے وابستہ تھے اور انہوں نے ۱۹۴۷ء کے جاں گداز لمحوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ''آشوبِ قیامت'' کے عنوان کے تحت انہوں نے اس زمانے میں دلّی میں مسلمانوں کے خون سے کھیلی جانے والی ہولی کے واقعات کو نہایت سادگی اور دردمندی سے بیان کیا ہے۔ دلی میں مسلمانوں کو کس طرح ایک منظم اور سوچی سمجھی سازش کے تحت موت کے گھاٹ اُتارا گیا وہ انسانی تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ اس دور کے حالات وواقعات کے بیان سے یہ خود نوشت کی تاریخی اہمیت کی حامل بھی ہوگئی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کے دارالحکومت دلی میں کس طرح ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا اور ہندو سرکار خاموش تماشائی بنی رہی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ان دنوں دلی میں مقیم تھے، لہٰذا وہ ایسے رُوح فرسا واقعات کے چشم دید گواہ تھے۔ ان حالات کے بارے میں اپنے مشاہدات بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''مسلمانوں کی تعداد نئی دہلی کے ان مکانوں میں کچھ زیادہ نہیں تھی، لیکن ہر سڑک پر پانچ سات مکان مسلمانوں کے ضرور تھے۔ میں نے دیکھا کہ چند روز کے اندر مسلمانوں کے ان مکانوں پر کچھ خاص قسم کے نشانات لگائے جا رہے ہیں۔ خیال یہ ہوا کہ مردم شماری یا سرکاری محکموں کے لوگ یہ نشان لگا گئے ہیں۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ آر، ایس ایس اور جن سنگھ کی کارستانی ہے کہ جب لوٹ مار اور قتل و غارت گری شروع ہو تو مسلمانوں کے ان مکانوں کو پہچانا جا سکے، لیکن مسلمانوں کو ستمبر کے شروع تک اس کا علم نہ ہو سکا اور وہ اطمینان سے اپنے ان مکانوں میں بیٹھے رہے۔''(۲۸)

پاکستان آنے کے بعد ڈاکٹر عبادت بریلوی اورینٹل کالج لاہور سے وابستہ ہو گئے اور عمرِ عزیز کا تمام سرمایہ علمی وادبی کھیتیوں کو شاداب کرنے میں لگا دیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے لندن اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز، یونیورسٹی آف لنڈن اور انقرہ یونیورسٹی میں بھی خدمات سرانجام دیں اور وطن واپس آ کر پنجاب یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے۔ یوں ان کی ساری زندگی درس گاہوں کی مقدس فضاؤں میں تدریسی اور تحقیقی خدمات کی انجام دہی میں گزری۔ انہوں نے لاہور کی سماجی اور تہذیبی زندگی کی بھی سادگی سے تصویر کشی کی ہے اور لاہور کے علمی وادبی حلقوں کا تعارف بھی مختصر انداز میں کروایا ہے:

> ''لاہور ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کا شہر تھا۔ یہاں میں نے جو تہذیبی اور ثقافتی ماحول دیکھا، وہ دنیا کے کسی اور شہر میں مجھے نظر نہیں آیا۔ اس شہر میں ہر پڑھا لکھا آدمی مجھے ادب سے دلچسپی لیتا ہوا نظر آیا، اور ادب سے اسی دلچسپی نے ان میں سے خاصی تعداد کو ادیب اور

شاعر بنا دیا۔ یہاں ادبی انجمنوں کی بہتات دیکھی اور سب کو فعال اور مستعد پایا۔ حلقۂ ارباب ذوق کو ان سب میں زیادہ باقاعدہ اور مستعد دیکھا۔ حلقے سے میرا تعلق پرانا تھا اس لیے میں باقاعدگی سے ہر اتوار کو اس کے جلسوں میں جاتا تھا۔ ان جلسوں میں اعلیٰ پائے کے تنقیدی مقالات، افسانے، غزلیں اور نظمیں پڑھی جاتی تھیں، اور ان پر بلند معیار کی تنقید بھی ہوتی تھی۔''(۲۹)

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے خودنوشت میں انھوں نے اپنی تدریسی زندگی کے تجربات و مشاہدات کو بھی سلیقے سے بیان کیا ہے۔ ان کی باریک بین نظر ملکی تعلیمی نظام میں مسائل کے مختلف پہلوؤں کا نہ صرف تجزیہ کرتی ہے بلکہ وہ ان کے حل کے لیے دانشمندانہ تجاویز بھی پیش کرتے ہیں۔ ''یادِ عہدِ رفتہ'' اردو کے ایک نامور نقاد کی خودنوشت ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس خودنوشت میں ڈاکٹر عبادت بریلوی ایک رومانوی نثر نگار کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔ انھوں نے اپنی داستان حیات اس پرلطف انداز میں بیان کی ہے کہ آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیا ہے۔ یہاں فرد اور سماج پہلو بہ پہلو چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ سماجی ماحول کی تمام جزئیات کے بیان نے اسے ایک لازوال حسن سے ہمکنار کیا ہے۔ یہ خودنوشت ایک گم گشتہ تہذیب کے مٹتے ہوئے خدوخال کی ایک روشن تصویر ہے جس کے رنگ اس کے صفحوں میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کے تمام ادوار کو ترتیب وار بیان کیا ہے اور اپنی یادوں کی ڈوری کو کہیں بھی الجھنے نہیں دیا۔ حالات وواقعات کی راست انداز میں تصویر کشی کے باوجود اس خودنوشت میں ایک افسانے کا سا حسن اور غزل کی سی چاشنی پائی جاتی ہے۔ اس میں خارجیت اور داخلیت کا ایک حسین امتزاج موجود ہے۔ خودنوشت کے بعض حصوں پر کسی ناول کا گمان ہوتا ہے۔ حسن فطرت کی نغمہ سرائی سے شروع ہونے والی اس خودنوشت کا اختتام تاثیر محبت کی مدح سرائی پر ہوتا ہے:

''محبت کی معنویت میں بڑی وسعت اور کشادگی، گہرائی اور گیرائی، رنگارنگی اور بوقلمونی ہے۔ وہ روشنی ہی روشنی ہے، نور ہی نور ہے، وہ تاریکیوں کو روشنی سے ہمکنار کرتی ہے۔ حسن کا احساس دلاتی ہے، حسن نظر پیدا کرتی ہے، کائنات کو حسین، دل کش اور دل آویز بناتی ہے، حیات انسانی کو زندگی بخشتی ہے، انسانی رشتوں کی اہمیت کو دل نشیں کرتی ہے، دلوں میں درد جگاتی ہے، سوز و گداز کو بیدار کرتی ہے، اور جذبات و احساسات کو تہذیب و شائستگی سے آشنا کرتی ہے۔ ذہن کے دریچوں کو کھولتی ہے، بصارت اور بصیرت کے چراغ جلاتی ہے، فہم و فراست کی شمعیں فروزاں کرتی ہے، اور اس کو بسر کرنے، برتنے، اس سے رس نچوڑنے اور اس کی مسرتوں سے سینہ بھر لینے کے آداب آتے ہیں۔ جگرؔ صاحب نے کیا خوب کہا ہے:

محبت زندگی ہی زندگی ہے
مگر تجھ بن مرے کس کام کی ہے''(۳۰)

مختصر یہ کہ ''یادِعہد رفتہ'' نہ صرف ڈاکٹر عبادت بریلوی کی زندگی کی مکمل عکاسی کرتی ہے بلکہ اپنے دور کی علمی، ادبی، تہذیبی، معاشرتی اور تعلیمی صورت حال کی مکمل تاریخ کا درجہ بھی رکھتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، کلچر کیا ہے؟، مشمولہ: کلچر، [منتخب تنقیدی مضامین]، مرتبہ: اشتیاق بیگ، لاہور: بیت الحکمت، ۲۰۰۷ء، ص ۸۱

۲۔ سبطِ حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۸۹ء، آٹھواں ایڈیشن، ص ۱۳

۳۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، اسلامی ہندی کلچر، مشمولہ: کلچر، مرتبہ، اشتیاق بیگ، لاہور: بیت الحکمت، ۲۰۰۷ء، ص ۲۴۶

۴۔ تجمل حسین ہاشمی، ہمارا معاشرہ، لاہور: ابلاغ پبلشرز، جنوری، ۲۰۰۱ء، ص ۳۲، ۳۱

۵۔ فیض احمد فیضؔ، پاکستانی تہذیب کے اجزائے ترکیبی، مشمولہ، کلچر، مرتبہ، اشتیاق بیگ، لاہور: بیت الحکمت، ۲۰۰۷ء، ص ۲۲۲

۶۔ قمر الہدیٰ فریدی، ڈاکٹر، خودنوشت: محرکات اور فنی تقاضے، مشمولہ: نئی کتاب، سہ ماہی، شمارہ: ۱۴، دہلی، جولائی، ستمبر ۲۰۱۰ء، ص ۴۰

۷۔ حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، ادبی اصطلاحات کا تعارف، لاہور: مکتبہ اسلوب، مئی ۲۰۱۵ء، ص ۷

۸۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، یادِ عہدِ رفتہ، لاہور، ادارہ ادب وتنقید، ۱۹۸۸ء، ص ۱۲

۹۔ ایضاً، ص ۲۲

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۴

۱۱۔ ایضاً، ص ۵۸

۱۲۔ حسن وقار گل، ڈاکٹر، اُردو سوانح نگاری آزادی کے بعد، کراچی: شعبۂ اردو، جامعہ کراچی، ۱۹۹۷ء، ص ۴۵۹

۱۳۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، یادِ عہدِ رفتہ، لاہور: ادارہ ادب وتنقید۔ ۱۹۸۸ء)، ص۔ ۶۹

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۵، ۱۴

۱۵۔ ایضاً، ص ۷۸۔ ۷۷

۱۶۔ ایضاً، ص ۵۵

۱۷۔ ایضاً، ص ۴۳

۱۸۔ ایضاً، ص ۴۴، ۴۳

۱۹۔ ایضاً، ص ۸۴

۲۰۔ ایضاً، ص ۸۵

۲۱۔ ایضاً، ص ۸۷

۲۲۔ ایضاً، ص ۸۸

۲۳۔ ایضاً، ص ۳۷

۲۴۔ ایضاً، ص ۲۵۶، ۲۵۵

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۵۶، ۱۵۵

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۵۶

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۱۵

۲۸۔ ایضاً، ص ۲۲۳
۲۹۔ ایضاً، ص ۲۹۷
۳۰۔ ایضاً، ص ۴۰۹